

پرسٹن یونیورسٹی امریکہ میں ڈاکٹر فضل الرحمان کی اسلام کے خلاف زہر افشانی

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب مدرسہ احیاء العلوم مامونہ کالج
ضلع لاٹیل پور

۴ مئی ۱۹۶۶ء سے ۱۱ مئی ۱۹۶۶ء تک امریکہ کی پرسٹن یونیورسٹی میں ایک مذاکرہ ہوا تھا جس میں دنیا کے تمام مذاہب کے نمائندے شریک ہوئے تھے۔ اس مذاکرہ میں ان مذاہب سے تعلق رکھنے والے مختلف موضوعات پر مقابلے پڑے گئے۔ (فکر و نظر جلد ۲، ص ۱۱) اسی عالمی مذہبی کانفرنس میں پاکستان کے مندوب، ادارہ تحقیقات اسلامی کے نمائندہ اور اسلام کے وکیل کی حیثیت سے جناب ڈاکٹر فضل الرحمان صاحب بالقابہ صدر ادارہ تحقیقات اسلامی بھی شریک ہوئے، اس طرح آپ کیلئے اپنے ہم مسلک وہم شریک، ہم ذوق و ہمراز اور ہم نوالہ وہم پیالہ احباب سے شرفِ ملاقات، ہم کلامی اور سات آٹھ دن تک کچھ اپنی کہنے اور کچھ انکی سننے کا اندیشہ مرقعہ ہاتھ آیا۔ ذرا تصور کیجئے امریکہ کا آزاد ماحول، پرسٹن یونیورسٹی کی پرکیف فضا، نہ خطرہ محتسب، نہ شور و شغب ملا، ہم اور آپ کو کیا اندازہ ہو سکتا ہے کہ سوز و ساز اور لذت و میاں کی کتنی داستانیں دہرائی گئی ہونگی، اسلام کسے کتنے مثالی معیار اور نصب العین طے ہوئے ہونگے، اور ان کو بدلتے ہوئے مظاہر و احوال میں ترقی پسندانہ عملی جامہ پہنا نہ کیلئے کیا کیا محبوبے زیرِ غور آئے ہونگے؟ روایتی اسلام کی تدفین کے لئے کن کن تدابیر پر سورج بیچار

ڈاکٹر صاحب کے مکتب فکر کے نزدیک اسلام کی تفسیر یہ ہے: "اسلام نام ہے چند مثالی معیارات اور نصب العینوں کا جن کو مختلف معاشرتی مظاہر و احوال میں ترقی پسندانہ طور پر عملی جامہ پہنانا ہوتا ہے۔" (فکر و نظر جلد ۲، ص ۱۱) یہ تفسیر پروفیسر جی خان محمد مہمان اور بعض دوسرے نامور غیر مسلم محققین کے آپ نے حاصل کی ہے۔ (فکر و نظر جلد ۲، ص ۱۲) یہ تفسیر اہل تیرہ صدیوں کا اسلام ان کی اصطلاح میں "دھابتی اسلام" یا "راسخ العقیدہ گروہ" کا اسلام کہلاتا ہے۔ ان کے نزدیک

مردہ ہے۔

ہوتی ہوگی، زیادہ واضح الفاظ میں یہ کہ تجدد پسندانہ اصلاح اسلام کے کیا کیا وسائل و ذرائع زیر بحث آئے ہوں گے۔ فارسی شاعر کی زبان میں —

آنجا کرا دماغ کہ پرسد ز باغیاں بلیل چہ گفت، گل چہ شنید و صبا چہ کرد

یہ تمام امور ہمارے لئے بہر حال پردہ غیب میں ہیں۔ البتہ ”مدیر فکر و نظر“ کا ممنون ہونا چاہئے کہ کہ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے انگریزی مقالہ جو اسلام کی طرف سے آپ نے اس موقع پر پیش کیا تھا کے اردو ترجمہ کئے اور اسکی اشاعت کی زحمت فرمائی، مقالہ کا اردو عنوان ہے — ”اسلام پر تجدد پسندی کے اثرات“ — یہ مقالہ ایک دوبار نہیں بلکہ کئی بار ہم نے بھی پڑھا۔ اس کے مضمرات پر غور کیا، اور ڈاکٹر صاحب کی اسلام پر بحث کو خوب جانچا پرکھا، پہلے ہم اس خوش فہمی میں مبتلا رہے کہ ڈاکٹر صاحب اس موقع پر اسلامی ملک کے مندوب، اسلامی ادارہ کے سربراہ اور اسلام کے وکیل کی حیثیت سے تشریف لے جا رہے ہیں۔ ان کے نظریات کچھ بھی ہوں لیکن آخر قیامت تو نہیں آگئی وہ اپنی اس پوزیشن کا لحاظ کرتے ہوئے ”مذہب عالم کا نفرس“ میں اسلام کی کچھ تولا رکھیں گے۔ مگر ”عالم اسلام“ کی امیدوں کے برعکس آپ نے سب کے سامنے اسلام کی وہ پٹائی کی اور جارحیت کا ایسا شدید مظاہرہ کیا کہ ہمیں اپنی خوش فہمی پر ماتم کئے بغیر اور مدبرانہ فکر و نظر کو حکومت اور ادارہ تحقیقات دونوں کی طرف، ہمیں اس سے کوئی تعلق نہیں ”کا اعلان کئے بغیر نہ بن پڑی، وہ فرماتے ہیں:—

”یہ مقالہ اسی منکرہ میں پڑھا گیا، بن خیالات کا اس میں اظہار کیا گیا ہے وہ فاضل مقالہ نگار کی اپنی تحقیق کا نتیجہ ہیں۔ حکومت پاکستان یا ادارہ تحقیقات اسلامی کی پالیسی سے ان کا کوئی تعلق نہیں“ (فکر و نظر جلد ۲، صفحہ ۱ ص ۹)

ہم تمام عالم اسلام بالخصوص مسلمانانِ پاکستان کی طرف سے ”فکر و نظر“ کے مدیر محترم کے شکر گزار ہیں، کہ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے سو قیامہ قسم کے مقالہ کی ذمہ داری سے انکار کر دیا، ان کا یہ اقدام مستحقِ صدمہ مبارکباد ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کے مکروہ پروپیگنڈہ کی ذمہ داری نہ کوئی اسلامی حکومت اٹھا سکتی ہے، اور نہ کوئی سنجیدہ ادارہ اس بابہ گراں کا متحمل ہو سکتا ہے۔ اگر وہ یہ اعلان نہ کرتے تو ملک اور بیرون ملک کے زخمی دل مسلمانوں کو بڑی مایوسی ہوتی۔ البتہ یہ معما ہمارے فہم سے بالاتر ہے۔ شاید فکر و نظر کے مدیر محترم اسے حل کر سکیں۔ کہ ایک شخص کسی حکومت یا ادارہ کا نمائندہ اور سفیر بن کر جائے، لیکن جب وہ فرائضِ سفارت انجام

دسے چکے تو حکومت اور ادارہ اپنے نمائندہ کی ذمہ داری سے انکار کر دے، ادارتی اور سفارتی تاریخ میں اسکی کتنی مثالیں ملیں گی۔ یہ تو دیکھا سنا تھا کہ اگر کسی نمائندہ نے حکومت یا ادارے کی پالیسی کا احترام کئے بغیر کوئی بیان جاری کر دیا تو نہ صرف یہ کہ وہ معزول کر دیا جاتا ہے، بلکہ اس کے خلاف مناسب کارروائی بھی عمل میں لائی جاتی ہے۔ مگر ہماری ناقص معلومات میں یہ کبھی نہیں آیا، کہ سفیر عہدہ سفارت پر، نمائندہ منصب نمائندگی پر اور صدر کرسی صدارت پر بدستور قائم رہتے ہوئے اپنی حکومت اور ادارہ کی پالیسی سے لاتعلقی بیان دیتا رہے۔ اس کے باوجود نہ اسے کسی قسم کی سسرولش کی جائے، نہ اسکی معزولی عمل میں آئے، نہ اسے کسی درجہ میں قابل ملامت تصور کیا جائے، بلکہ اس تمام قصہ کو ”فاضل مقالہ نگار کی اپنی تحقیق کا نتیجہ“ کہہ کر گول کر دیا جائے۔

اور اس معامی ناقابل فہم پیچیدگی اس وقت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے، جب کہ ہم ”فکر و نظر“ کے فاضل مقالہ نگار کے مقالہ میں صدر مملکت اور ادارہ تحقیقات اسلامی کی صاف صاف نمائندگی ان الفاظ میں پڑھتے ہیں:-

”صدر محمد الہدب خان کی حکومت نے ۱۹۶۰ء میں ایک ادارہ ادارہ تحقیقات اسلامی کے نام سے علوم اسلامی میں تحقیقات، اور جدید ضرورتوں کے لئے اسلام کی تعبیر و تشریح کی غرض سے قائم کیا ہے۔ ۱۹۶۲ء میں اس ادارہ کو ایک آئینی حیثیت دی گئی ہے۔“

”ادارہ تحقیقات اسلامی کے مطالعہ نے بتلایا۔ الخ“ ادارہ تحقیقات کا استدلال یہ تھا:-

”فاضل مقالہ نگار“ کے یہ بیانات کسی وکیل، بیرسٹر اور جج کے سامنے رکھیے، کیا وہ یہ فیصلہ دے گا، کہ مقالہ نگار صرف اپنے خیالات کی ترجمانی کر رہا ہے۔؟ ڈاکٹر صاحب کے یہ الفاظ پکار پکار کر اعلان کرتے ہیں، کہ وہ اپنی زبان سے نہیں، بلکہ صدر مملکت اور ادارہ تحقیقات اسلامی کی زبان سے بول رہے ہیں۔۔۔۔۔

انہیں کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان اپنی ہے بات انکی

ان ہی کی محفل سجاد ہوں چراغ اپنا ہے راست ان کی

پھر اس معامی الجھن میں مزید بر مزید اضافہ اس وقت ہو جاتا ہے، جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ ”زہر آب مقالہ“ جو ایک خاص ماحول میں پڑھا گیا تھا۔ بجائے اس کے کہ اسے دفن کر دیا جاتا، ہوا کی

ایک طرف ”ادارہ تحقیقات اسلامی“ اس مقالہ کے اردو، عربی، بنگلہ تراجم اپنے مجلات میں ہزاروں ملک شاید لاکھوں کی تعداد میں چھاپ کر پورے پاکستان بلکہ کل عالم اسلام اور دیگر ممالک میں اس شر کو پھیلاتا ہے۔ اور دوسری طرف بڑی معصومیت اور آبلہ فریبی سے ساتھ ساتھ یہ اعلان بھی شائع کرتا ہے :-

”یہ مقالہ نگار کی اپنی تحقیقات کا نتیجہ ہے، حکومت پاکستان یا ادارہ تحقیقات اسلامی کی پالیسی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔“

اگر واقعی ادارہ تحقیقات کو اس سے کوئی تعلق نہیں، تو مختلف زبانوں میں بڑی آب و تاب کے ساتھ اس کی اشاعت کے کیا معنی؟

ہیں ادارہ تحقیقات کی اس پالیسی اور طرز عمل سے اندیشہ ہے، کہ جس طرح آج مدیر فکر و نظر نے اپنے صدر محترم کے متعلق اعلان کر دیا، اسی طرح کل ان کے اسی اعلان کے بارے میں ادارہ کے کوئی دوسرے مدیر صاحب یہ اعلان نہ کر دیں کہ :-

”ڈاکٹر صاحب کے مقالہ سے متعلق ”مدیر فکر و نظر“ نے جو اعلان لا تعلقی فرمایا ہے۔ یہ ”فاضل مدیر فکر و نظر“ کی اپنی تحقیقات کا نتیجہ ہے۔ حکومت پاکستان یا ادارہ تحقیقات اسلامی کی پالیسی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔“

کیا یہاں ادب و احترام ملحوظ رکھتے ہوئے فکر و نظر کے فاضل مدیر سے یہ سوال کیا جاسکتا ہے؟ کہ آپ اپنے ادارہ کی پالیسی کا اعلان بصد شوق کریں۔ لیکن حکومت پاکستان کی پالیسی کے اعلان کا منصب انہیں کب سے تفویض ہوا؟ یہ سوال اس لئے اہمیت رکھتا ہے، کہ اگر ادارہ تحقیقات اسلامی کے صدر محترم جناب ڈاکٹر فضل الرحمن کا مقالہ ”غیر ذمہ دارانہ“ ہو سکتا ہے، تو ان کے نائب، مدیر فکر و نظر کے اعلان پر کون اعتماد کرے گا؟ اگر واقعی حکومت پاکستان کی پالیسی سے ڈاکٹر صاحب کے ان خیالات کا کوئی تعلق نہیں تھا، تو حکومت پاکستان کی وزارت اطلاعات و نشریات یا کسی اور متعلقہ محکمہ کی جانب سے کیوں اس سے بیزار ہی کا اعلان نہ کیا گیا؟ یا حکومت کے نزدیک ڈاکٹر صاحب کا یہ مقالہ اس قدر غیر اہم اور لایعنی ہے۔ کہ وہ اس کے بارے میں کسی دماغی بیان کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتی؟

بہر حال ڈاکٹر صاحب کا یہ مقالہ خود ایک معما ہے۔ اس پر مدیر فکر و نظر کا اعلان لا تعلقی معما در معما ہے۔ باایں ہمہ ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ کہ اس ”غیر ذمہ دارانہ مقالہ“ سے لا تعلقی معما

"غیر ذمہ دارانہ اعلان" تو کہہ ہی دیا — عجب بلا یوں دے اگر ایں ہم نہ یوں دے۔

مقالہ سے متعلق ان ابتدائی امور کے بعد اب اس کے مشمولات پر نظر ڈالئے، موصوف اپنی بحث کے حدود متعین کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"یہاں مجھے جس مسئلے سے بحث کرنا ہے، وہ کافی حد تک محدود اور بسیط ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اسلامی دنیا اور دوسری وسیع تر دنیا، دونوں کیلئے بہت زیادہ فوری اہمیت رکھتا ہے، میرا ارادہ تجدید۔ یعنی جدید زمانے کے مطابق اپنے آپ کو کرنے، یا زیادہ واضح الفاظ میں حدت پسندی کے بارے میں کچھ کہنا ہے۔ اور اسلامی دنیا پر جدید طرز زندگی کس حد تک اثر انداز ہوتی ہے، اس کا ایک مجموعی جائزہ لینا ہے۔ اس سے خود اسلامی دنیا، اور دوسری وسیع تر دنیا کے لئے مستقبل قریب میں مسلم معاشرے میں مناسب حد تک متوقع تبدیلیوں کی نوعیت اور وسعت واضح کرنے میں مدد ملے گی۔"

آپ اس سے سمجھ گئے ہوں گے کہ موصوف، تجدید، تجد، اپنے کو جدید زمانے کے مطابق ڈھالنے یا واضح الفاظ میں حدت پسندی کے محامل، اثرات اور تدابیر پر بحث کریں گے۔ یعنی اسلام کو نئی دنیا کے مطابق کتنا بدلا جا چکا ہے، کتنا بدلا جا سکتا ہے، کس طرح بدلا جا سکتا ہے، اور یہ بدلنا کیوں ضروری ہے۔ اس اقتباس میں موصوف نے دو جگہ اسلامی دنیا کے ساتھ "دوسری وسیع تر دنیا" کے لئے اس مسئلہ کی بہت زیادہ فوری اہمیت کا جو ذکر فرمایا ہے، اسے کسی طرح نظر انداز نہ کیا جائے، موصوف یہ بتلانا چاہتے ہیں، کہ اسلام کی تبدیلی میں اسلامی دنیا کو دلچسپی ہر یا نہ ہو، لیکن دوسری وسیع تر دنیا "بالخصوص صحیحیت، یہودیت اور عیسائی کیونکہ ہم ان کے حامین بڑی بے چینی سے منتظر ہیں، کہ مسلمان اپنے اسلام اور اسلامی ورثہ کو خیر باد کہہ کر لادینیت، سیکولرزم، یا مذہب کی بگڑی ہوئی صورت کو اپنا کر کب ہماری سطح پر آجاستے ہیں، تاکہ مسلمانوں کو یہ کہنے کا موقع باقی نہ رہے، کہ اپنی اصلی شکل میں صحیح مذہب اگر کوئی موجود ہے تو وہ اسلام ہے۔"

اس حرف آغاز کے بعد موصوف اصلاحی تحریکوں کا تذکرہ شروع کرتے ہیں۔ اس ضمن میں دہائی تحریک اور سنوسی تحریک اور ان جیسی دوسری تحریکوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"لیکن انہیں کسی طرح بھی حدت پسند اصلاحی تحریکیں نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ صاف طور پر انکی اصلاحی سرگرمیوں کی حدود تمام کی تمام مسلمانوں کے ماضی کے چوکھٹے میں منحصر نہیں۔"

یعنی جدت پسندی کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ اسلام کے ماضی سے وہ اپنا رشتہ بالکلیہ کاٹ لے، اور یہ تحریکیں اس شرط کے محروم بنیں۔ اس کے بعد جدت پسندی کے اصل نقطہ آغاز کی نشاندہی کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

”دنیا کے اسلام میں تبدل کے عمل و عمل کی ابتداء اس وقت ہوئی، جب کہ مغربی طاقتوں کی مسلمان ممالک کے ساتھ فوجی اور سیاسی مداخلت ہوئی“ ص ۱۱

اس ذیل وہ شیخ محمد عبدالعزیز، اور سر سید احمد خاں کی سائنسی تحریک کا ذکر کرتے ہیں، اور ان دونوں میں مشابہت اور مفارقت کی صورتیں ذکر کرنے کے بعد ان دونوں تحریکوں کے تباہ کن حشر کا ذکر کرتے ہیں، اس کے بعد وہ جدت پسندی کے ایک اور مرحلہ کی نشاندہی کرتے ہیں، جسے ان کی اصطلاح میں علامہ محمد اقبال کا مرحلہ کہا جاسکتا ہے، اس کے بارے میں موصوف کا خیال ہے کہ :-

”اس مرحلے میں مسلمانوں کا معذرت خواہانہ انداز مغرب کے خلاف ایک جارحانہ اقدام کی شکل اختیار کرتا ہے۔ اور ان کی ممانعت، جارحیت میں بدل جاتی ہے۔ مغرب کے خلاف اس طرز فکر نے جو کہ صریحاً دو رخا پن کا حامل ہے، قدامت پسندوں اور جدت پسندوں کی صفوں کو باہم ایک دوسرے کے بہت قریب کر دیا، اتنا قریب کہ بعض دفعہ دونوں میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے“ ص ۱۲

موصوف کے نزدیک جدت پسندی کی یہ تحریک بھی قدامت پسندوں کی نظر ہو کر رہ گئی، ان تمام تحریکات کی ناکامی کا اصل باعث کیا تھا؟ اس سلسلہ میں موصوف نے بڑی جزات مندانہ بات کہی ہے، ان کا یہ ”تجرباتی نظریہ“ ان کی ”اسلامی ذہنیت“ کو پوری طرح داشگاہنا کر دیتا ہے۔ فرماتے ہیں :-

”یہ سوال کہ خالص دنیوی اقلیت اور سائنسی ذہنیت کتنی دور تک اور کتنی گہری قبول ہو سکتی ہے، اگر روایتی مذہبی تصورات و اعمال اس سے نہایت سختی سے الگ رکھے جائیں؟ کافی سوچ میں ڈالنے والا ہے، تجربہ یہ بتلاتا ہے کہ یہ کبھی قابل قبول نہیں ہو سکتی جب تک کہ مذہب کو زندگی پر قطعی طور سے اپنی گرفت ڈھیل کر سنے کی اجازت نہ دی جائے، لیکن جب تک زندگی پر مذہب اپنی گرفت مضبوط رکھتا ہے تو ایک طرف خالص دنیوی جدید عقلیت اور سائنسی ذہنیت، اور دوسری طرف روایتی مذہبی تصورات و اعمال دونوں کو ایک

دوسرے سے شراہ کتنی بھی سختی سے الگ الگ رکھا جائے، مذہب دنیوی افکار کو بھی داخل دوسرے سے بڑے موثر طریقے سے روکے گا۔ یہ بات اگرچہ بظاہر متناقض نظر آتی ہے، لیکن واقعہ یہی ہے۔" ص ۱۵

خلاصہ یہ کہ موصوف کے نزدیک مسلمانوں کی تمام بیماریوں کی جڑ "مذہب اسلام" ہے۔ اس لئے مسلمان اگر اس بیماری سے شفا یاب ہو کر ترقی کرنا چاہتے ہیں تو راستے کے اس پتھر کو ہٹائیں، مذہب اسلام کو زندگی سے اپنی گرفت ڈھیلی کر دینے پر مجبور کریں، بس مسلمان جب قدر مذہب سے دور اور لامذہبیت کے قریب ہوتے چلے جائیں گے، اسی قدر ان کے سامنے زندگی کی ترقی کی راہیں کشادہ ہوتی چلی جائیں گی، اور ان کو ترقیاتی عروج پورا پورا اس دن نصیب ہوگا، جس دن وہ مذہب اسلام کو بالکل خیر باد کہہ دیں گے، اس کے بعد موصوف اپنے مقالہ میں اسلام کی جگہ لامذہبیت کو اپنا سن کی دعوت برابر دیتے چلے گئے ہیں، مثلاً ایک جگہ علماء اسلام کی طرف سے اسلامی عقاید اور احکام کی حفاظت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"علماء اسلام کا یہی وہ نقطہ نظر ہے جو اسلامی دنیا میں سیکولرزم، لامذہبیت کے پھیلنے کا براہ راست ذمہ دار ہے۔" ص ۱۶

پھر اس کی مثال کیلئے "شرح زکوٰۃ" کو ملوانہ منطق کے ساتھ ذکر کرنے کے بعد آخر میں فرماتے ہیں:-

"واقعہ یہ ہے کہ جدید زندگی اور روایتی اسلام (جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اب تک محفوظ چلا آ رہا ہے) کے درمیان ٹکراؤ کے اس تمام عرصہ میں علماء کی اکثریت کی طرف سے جس نقطہ نظر کا اظہار ہوتا رہا ہے۔ وہ حقیقت میں سیکولرزم کا براہ راست مدد و معاون ہے۔" ص ۱۷

ایک جگہ پاکستان میں اسلام کی ضرورت سیکولرزم کے فعال اور موثر قوت بننے تک کو بڑی صراحت سے ذکر کرتے ہیں:-

"مزید برآں پاکستان کے دو حصے ہیں۔ جو جغرافیائی لحاظ سے ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔ اور یہ صورت حال ہندوستان تک کو دہیٹ نہیں۔ اب جب تک کہ سیکولرزم مثبت ترقی کے لئے ایک فعال اور موثر قوت نہ بنائی جاسکے، ان ملکوں کے لئے یہی ایک صورت ممکن نظر آتی ہے کہ وہ مذہب کو مملکت کی اساس تسلیم کریں۔" ص ۲۳

ایک جگہ اسلامی مملکت ہونے کی وجہ سے پاکستان کی مشکلات اور اس کے مقابلہ میں

ایک سیکور ملکیت کی آسائیوں کو بڑے لچاتے ہوئے انداز میں ذکر کرتے ہیں۔

لیکن یہی وہ اصل سوال ہے، یعنی اسلام کی نئی تعبیر کی دریافت، جس کا ذہنی سطح پر حل تلاش کرنے میں سرکاری پالیسی مایوس کن رہی ہے۔ ادلاً ہمیں تسلیم کر لینا چاہیے کہ اس طرح کے تمام مسائل کے حل۔ جیسے کہ اقلیتوں کے ساتھ کیا سلوک ہو، اور صنعتی اور تکنیکی تبدیلی سے جو معاشرتی نتائج نکلیں گے، ان کے پیش نظر ترقیاتی پروگرام کیا ہوں۔ ایک سیکور ملکیت میں زیادہ آسانی سے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ سیکوریزم تو ہے ہی روایتی رکاوٹوں اور تعصبات سے نجات پانے کے لئے ایک جرات مندانہ قدم، خواہ اس کے لئے کتنی بھی بڑی قیمت ادا کرنی پڑے۔ اب چونکہ پاکستان ایک اسلامی ملکیت ہے۔ اس لئے اسے ان مسائل کے حل کرنے کے لئے بڑی مشکلات درپیش ہیں۔ ص ۲۳

ایک مقام پر ان نام نہاد مشکلات کے حل کے لئے بزعم خود تعبیر و تاویل کا قابل قبول طریقہ پیش کیا ہے، اور اس سلسلہ میں تعدد ازواج کی بحث کو اٹھا کر حسب عادت اس پر طویل تقریر کی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ قرآن کا اصل منشا تو یہ ہے کہ عام حالات میں ایک مرد کیلئے ایک بیوی کا ہونا ہی "مثالی" حیثیت رکھتا ہے۔ مگر زمانہ نزول کے معاشرے سے اسے مصالحت کرنا تھی اور اس معاشرے میں تعدد ازواج کی بڑی گہری جھین اس لئے اسے قانونی سطح پر تعدد ازواج کو قبول کرنا پڑا۔

"تاہم رسول مقبول علیہ السلام کی یہ آرزو تھی کہ مسلمان اس مثالی معاشرے کو بدرجہ اپنائیں گے۔ بہر حال تاریخی لحاظ سے ہوا برعکس، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد بڑے وسیع پیمانے پر مسلمانوں کو فتنات حاصل ہوئیں، جن کے نتیجے میں مسلم معاشرے میں بہت بھاری تعداد میں باہر سے عورتیں اور لونڈیاں، اور یہ پھر اس معاشرے میں قرآن کے اصل مقصد کے لئے رکاوٹ بن گئی۔ ص ۲۴

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جس آرزو کی نسبت کی گئی ہے۔ اس کا علم موصوف کو کن ذرائع سے ہوا۔؟ یہ تو انہیں کو معلوم ہوگا، لیکن ان کی عبارت سے اتنی بات بہر حال صاف ہو جاتی ہے کہ ان کے نزدیک قرآن کے مثالی معاشرہ کا جو تصور ہے، اسے نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنا سکے، نہ خلفاء راشدین، نہ صحابہ، نہ تابعین، نہ آئمہ مجتہدین، نہ چودہ سو سالہ امت، بلکہ موصوف کے بقول یہ تنہا ہی کبھی شرمندہ وقوع نہ ہو سکی، البتہ تعبیر و تاویل کے جدید پیشے سے پاہا جاتا ہے کہ

قرآن کو تراش تراش کر یہ مثالی معاشرہ قائم کر دیا جائے۔ غالباً پاکستان میں مسلم فیملی لازماً کے ذریعہ پہلی دفعہ آپ کی آرزو کو پورا کرنے کے لئے مارشل لا کی فرصت تلاش کی گئی۔ سبحان اللہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی آرزو کا انکشاف ہوا کس کو؟ پچودہ سو سال بعد کے ڈاکٹروں کو، جن کے نزدیک اسلام خود ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی کے ذیل میں انہوں نے مسئلہ غلامی کا ذکر بھی کیا ہے۔

— فرماتے ہیں: —

”ادبیہ غلامی کے مسئلہ میں ہوا۔ جسے قانونی سطح پر تو برداشت کر لیا گیا، لیکن اس کے ساتھ ہی ایک اخلاقی محرک عمل میں لایا گیا، کہ اسکی وجہ سے یہ ختم ہو جاتی ہے۔ اسلامی تاریخ نے اس مقصد کو بھی ناکام کر دیا۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے تاریخی وجوہ ہیں: ص ۲۱

تاریخی وجوہ کچھ بھی ہوں، لیکن مذاہب عالم کا نفرنس کے بھرے مجمع میں تمام دنیا کے نمائندوں کے سامنے یہ اعلان تو کر ہی دیا، کہ نہ صرف تعدد ازواج اور مسئلہ غلامی بلکہ پردے اسلام کو سمجھنے، اس کے منشا کو اپنانے، اور اسلام کی روح پر عمل کرنے میں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر اب تک اسلامی تاریخ کی تمام صدیاں ناکام رہیں۔ صحیح اسلام کا سراغ تحقیقات اسلامی کے ادارہ کو ملا ہے، — اسی کے متعل آپ نے اسلامی عقائد پر بھی بحث کی ہے، تمہیداً فرماتے ہیں: — ہم نے اب تک جن مثالوں کا انتخاب کیا وہ قانونی و اجتماعی معاملات کی ہیں۔ لیکن عقائد کا دائرہ بھی ان سے کچھ کم نہیں: ص ۲۱

یعنی مسلمانوں کا بصرف نظام قانون غلط ہے، بلکہ نظام عقائد بھی غلط، اس کے بعد اس غلطی کی وضاحت کے لئے آپ ایک عجیب و غریب اصول پیش فرماتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

”دنیا کے متعلق جدید آدمی کا جو تصور ہے، باوجود ان تمام اختلافات کے جو اس میں پائے جاتے ہیں، وہ قدردانِ دینی کے نقطہ نظر اور روایتی طرز فکر سے مختلف ہے۔ سند کو مان لینا، اور خوش اعتقادی ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ اور یہ سکے جدید دنیا میں اب چالو نہیں رہا۔ جب آپ سند کو مانتے ہیں تو اس کا نتیجہ لازماً خوش اعتقادی ہوتا ہے: ص ۲۲

موصوف کا مطلب یہ ہے کہ دین اسلام کے تمام اعمال، عبادات اور عقائد کا مدار سند پر ہے۔ اور سند کو مان لینے سے چونکہ خوش اعتقادی کا جن چھو جاتا ہے، اس وجہ سے یہ سکے جدید دنیا میں چالو نہیں رہا، لہذا ثابت ہوا کہ دین اسلام کا کوئی عقیدہ، کوئی قانون، اور کوئی عمل ”جدید دنیا“ میں چلت کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ — ہمیں معلوم نہیں کہ موصوف کو کس ”جدید آدمی“ سے ملاقات

کا شرف حاصل ہوا۔ جس کے مذہب میں سند اور خوش اعتقادی کا سکہ پھینک دئے جانے کا مستحق ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ سکہ امریکہ، برطانیہ اور روس بلکہ تمام ممالک میں اور تمام مملکتوں میں بڑی مقبولیت سے چلا رہا ہے۔ وہ کون سا ملک ہے، جہاں بین الاقوامی سفیروں، عدالتی بیانون، ماہرین فن کی شہادتوں پر اعتماد نہیں کیا جاتا، دنیا کا وہ کونسا جدید ملک، معاشرہ اور فرد ہے جس کے نزدیک کسی کا کسی کی بات پر اعتماد کرنا اسے سند تسلیم کرنا اور خوش اعتقادی اور پسندیدگی کا اظہار کرنا ناقابل معافی جرم ہے۔

ہمیں یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا، کہ یہ اصول کب سے پھیل نکلا ہے، کہ جو سکہ دنیا میں چالو نہ رہے۔ خواہ کتنا ہی قیمتی کیوں نہ ہو۔ اسے باہر پھینک کر حاکمیت آمیز دانشمندی کا مظاہرہ کر دو۔ عقل و نقل یہ اصول تو تسلیم کرتی ہے کہ اگر کوئی سکہ واقعی بے قیمت، کھوٹا اور روی ہو، اسے بڑی خوشی سے پھینک دیجئے، جس کم جہاں پاک۔ لیکن جس سکہ کو چودہ سو سال سے دنیا کی ہر سنجیدہ قوم جانچ پرکھ کر اس کے قیمتی جوہر ہونے کا اعتراف کرنے پر مجبور ہے۔ اسے محض اس وجہ سے پھینک دینا کہ چند احمق اسے کھوٹا بتلائے گئے ہیں، کیا عقل و فہم کا دیوالیہ نکال دینے کے مترادف نہیں؟ پھر جس جدید دنیا کا ذکر خیر ڈاکٹر صاحب فرما رہے ہیں، کیا اس میں قرآن، نبوت محمدیہ، حشر و نشر، حساب و کتاب اور جنت و دوزخ کا سکہ چالو ہے؟ اگر نہیں تو جدید دنیا کی خاطر یہ تمام سکہ بھی پھینک دیجئے، (اور موصوف ان سب کو پھینک چکے ہیں) ڈاکٹر صاحب نے بڑی سنجیدگی سے اس فقرہ میں جو خیال آرائی کی ہے۔ اگر ہمیں ان کا اور پرنسٹن یونیورسٹی کے سنجیدہ مذاکرہ کا احترام ملحوظ نہ ہوتا، تو ہمارے نزدیک اس کی حیثیت ”دیوالیہ کی بڑ“ اور ”بازاری گپ شپ“ سے زائد نہیں ہوتی۔ دیوالیہ گفت و ابلہ ہاں کر دو۔ ڈاکٹر صاحب پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ کیا وہ اتنا نہیں جانتے کہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا عمومی خوردہ ہی چیزیں رہی ہیں، جن کا سکہ قوموں کی حاکمیت، بگڑی ہوئی ذہنیت اور نسخ شدہ عقل کی وجہ سے دنیا میں چالو نہیں تھا، اب اگر ان کا یہ اصول صحیح ہو، کہ جدید دنیا میں جس سکہ کی چلت نہ ہو، اسے رد کرنا ہی صحیح عقلیت ہے۔ تو انبیاء علیہم السلام کی جانب سے پیش کردہ توحید، رسالت، تصور قیامت، بعثت بعد الموت، حشر و نشر وغیرہ مسائل جو اس وقت کے چلتے سکتے تھے علی الرغم پیش کئے گئے۔ ان کے متعلق ڈاکٹر صاحب کے ادارہ تحقیقات اسلامی سے کیا فتویٰ صادر ہوگا۔ موصیٰ علیہ السلام کی دعوت کا سکہ فرعون ماحول میں، ابراہیم علیہ السلام

کے نظریات کا سکتہ فردی ماحول میں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا سکتہ کی اور عربی ماحول میں کب چالو تھا؟

اصل قصہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب اور ان کے تحقیقاتی ادارہ میں "سورج و بچار" کا سکتہ چالو نہیں۔ اس لئے وہ کسی بات کے کہہ ڈالنے سے پہلے اتنا سوچ لینے کے قائل نہیں، کہ ان کے اس نظریہ کی زد میں کون کون آجائے گا۔

چالو سکتے کی بحث چل نکلی تو دل چاہتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں ایک گزارش مزید کر دی جائے، وہ یہ کہ ہم تسلیم کئے لیتے ہیں کہ جدید دنیا کی بگڑتی ہوئی اور خدا سے باغی انسانیت کے ماحول میں انبیاء علیہم السلام کے مآثر کی "سند" اور ان سے "خوش اعتقادی" کا سکتہ نہیں چلتا۔ لیکن یہ بھی تو ظاہر ہے کہ ڈاکٹر صاحب ہمیشہ کے لئے "پرنسٹن یونیورسٹی" میں مقالہ خوانی نہیں کرتے رہیں گے، سنت نبی آدم ان پر بھی آخر کار جاری ہو کر رہے گی، اور موت کا آہنی چنگل انہیں بھی ایک نہ ایک دن دبوچ کر رہے گا، وہ ہمیں بتلائیں کہ بازار آخرت میں کونسا سکتہ چلے گا، کیا پرنسٹن یونیورسٹی میں پڑھے ہوئے "ابن سینا اور راسخ العقیدہ اسلام اور" اسلام پر تجد و پسندی کے اثرات" قسم کے مقالے۔؟ ایں خیال است و محال است و جنوں انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ وہاں اسی روایتی اسلام کا سکتہ چلے گا جس کے ایک ایک حرف کا مذاق اڑانا ہی ان کے نزدیک تقاضائے "جدید عقلیت" ہے۔ اگر ہماری یہ گزارش بھی ان کے نزدیک "سندی خوش اعتقادی" میں داخل ہو تو قرآن مجید پڑھ دیکھیں، اس کا اعلان آج بھی وہی ہے جو کل تھا:

ومن لیشاقق الرسول من بعد ما	اور جو کوئی مخالفت کرے رسول کی جب کہ
تبین لہ الہدیٰ و یتبع عنبر	کھل چکی اس پر سیدھی راہ، اور چلے سب
سبیل المؤمنین لولہ ماتولی و	مسلمانوں کے رستے کے خلافت تو ہم حوالہ
نصلہم جہنم و ساءت مصبراً	کریں گے اسکو وہی طرف جو اس نے اختیار
(النساء رکوع ۱۷)	کی، اور ڈالیں گے ہم اسکو دوزخ میں اور

اور وہ بہت بُری جگہ پہنچا۔ (ترجمہ ۱۔ حضرت شیخ الہند)

ڈاکٹر صاحب اس آیت کے آئینے میں اپنے اس نظریہ کی، اور اس مقالہ کے دوسرے نظریات کی اور دیگر تمام مقالات کی اہل صورت دیکھ لیں۔۔۔۔۔ الغرض ڈاکٹر صاحب

کا یہ اصول ایک عجوبہ ہے، اب ذرا سیٹے کہ اس "عجوبہ" کی زد میں وہ دین اسلام کی کن کن چیزوں کو بے آتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

"اور خوش اعتقادی ہی اصل مورث ہے۔ ہر قسم کے جادو، ٹوٹکے پر یقین کرنے، کرامات پر زور دینے، اور بھونڈی شکل میں روحانی شعبہ بازی کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج کو عام طور پر حسب طرح پیش کیا جاتا ہے، وہ اس طرح کے توہمات پرستی کی، جس کا قرآن مجید سے کوئی ثبوت نہیں ملتا، ایک مثال ہے " ص ۲۱

صرف وہ کرامات جن کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے۔ ان ہی کی اگر فہرست مرتب کر لی جائے، تو ایک اچھا ضخیم مقالہ تیار ہو سکتا ہے، اور معراج نبویؐ کا ذکر قرآن مجید، احادیث متواتر جن کے راوی تیس کے قریب صحابہ ہیں، کے علاوہ تاریخ و سیرت کی ہر بڑی چھوٹی کتاب میں اجمالاً یا تفصیلاً موجود ہے۔ اور چودہ سو سالہ امت کا اجماعی عقیدہ ہے۔ اور ضروریات دین میں داخل ہے، مگر ڈاکٹر صاحب کی "توہمات پرستی" کی داد دیجئے، کہ آپ نے کرامت، معجزہ اور معراج نبویؐ ڈانڈے، جادو، ٹوٹکے اور بھونڈی شعبہ بازی سے جا ملائے۔ رہا یہ سوال کہ پھر یہ اجماعی عقیدہ مسلمانوں میں کہاں سے آیا، اور حدیث، سیرت اور تاریخ کے تمام ماخذ کے علاوہ قرآن مجید میں بھی کیسے درج ہو گیا۔؟ اس کا جواب یہ ہے کہ:

"معلوم یہ ہوتا ہے کہ جب سلمان جزیرہ عرب سے باہر نکلے اور خاص طور سے عراق میں ان کو عیسائیوں سے سابقہ پڑا، تو انہیں مجبوراً عیسائیوں کے اس اعتقاد کے جواب میں کہ حضرت مسیح علیہ السلام صلیب پر چڑھائے جانے کے بعد آسمان پر اٹھائے گئے تھے، معراج کو جہانی شکل میں پیش کرنا پڑا " ص ۲۱

چونکہ موصوف کی "عبدیہ دنیا" میں کسی دعویٰ کی دلیل اور سند پیش کرنا خوش اعتقادی کا دوسرا رنچ ہے۔ اس لئے اگر آپ یہ سوال اٹھائیں گے، کہ موصوف کو "معلوم یہ ہوتا ہے" کا انکشاف کن ذرائع سے ہوا۔ اور اسکی سند اور دلیل کیا ہے؟ تو آپ پھر سے "سندی خوش اعتقادی" میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اس لئے خیریت اسی میں ہے، کہ اسلامی عقائد کے بارے میں موصوف کے تمام انکشافات آپ بلا چون و چرا تسلیم کرتے جائیں، "سندی خوش اعتقادی" کے عفریت سے نجات کی بس یہی ایک صورت ہے۔ البتہ یہ خطرہ ضرور ہے کہ قرآن مجید سے آپ اسرار اور معراج نبویؐ کا ذکر سے بیٹھیں گے، لیکن اس سلسلہ میں معراج کا صحیح مفہوم جو موصوف نے

ازراہ عنایت بیان فرمادیا ہے۔ اسے سن کر اطمینان کر لیجئے، فرماتے ہیں :
 ”قرآن مجید نے کئی جگہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض آفاق گیر روحانی مشاہدات کا ذکر
 کیا ہے جن میں آپ کی الٰہی شخصیت طبعی حدود سے بلند و بالا تر ہو کر حقیقت اولیٰ کے محیطِ کل
 سے جا ملتی ہے“ ص ۲۱

اس تفسیر میں آپ کو ”آفاق گیر روحانی مشاہدات“ آپ کی الٰہی شخصیت، ”طبعی حدود
 سے اسکی بلندی و برتری“، ”حقیقتِ اولیٰ“ اور ”محیطِ کل“ جیسے مبہم، مجہول، اجنبی بلکہ
 بعض لایعنی الفاظ اور مفہوم ضرور ملیں گے، لیکن معراجِ جسمانی جیسے بالکل واضح، آسان اور عام فہم
 مسئلہ کی توہمات پرستی سے نجات پانے کے لئے ضروری ہے۔ کہ آپ موصوف کے اسی
 لایعنی قسم کے لفظی گورکھ دھند سے پر ایمان لے آئیں، ورنہ صدرِ ادارہ تحقیقات کی جانب سے
 خوش اعتقادی کا فتویٰ موجود ہے۔ کیونکہ یہ ”جدید دنیا“ ہے۔ یہاں قرونِ وسطیٰ کے سکے اور اصول بدل
 چکے ہیں۔ — بریں عقل و دانش بیاہد گریبت۔

موصوف نے توہمات پرستی کو جو مشین گن نصب کی ہے، اس کا سارا مسالہ ختم نہیں ہو گیا،
 ابھی اسکی گولہ باری باقی ہے، ارشاد ہوتا ہے :-

”اسی طرح مسلمانوں کے ہاں شفاعت کے مشہور عام عقیدے نے جو شکل اختیار کی ہے،
 وہ عیسائیوں کے کفارہ کے عقیدہ کا جواب تھا“ ص ۲۲
 بطور خلاصہ آخری بات یہ کہ :-

”عرض قرآن مجید کی واضح تعلیمات کے بالکل برخلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کثیر التعداد
 معجزات منسوب کر کے آپ میں ایک حد تک شانِ ایزدی پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی تھی“ ص ۲۳
 گویا صرف معراج، کرامت، شفاعت اور معجزات ہی نہیں، یہ تو صرف ”ایک مثال“ کے
 بطور ذکر کئے گئے ہیں ورنہ اس اصول کی روشنی میں ان امور کے علاوہ اسلام کے جس جس عقیدہ، عمل،
 یا مسئلہ کے لئے بھی کسی کا دل چاہے۔ تو ”خوش اعتقادی“ اور ”توہمات پرستی“ کا ہلکا سا فقرہ چست
 کیا جاسکتا ہے۔ رہا یہ سوال کہ بذریعہ معجزات نبیؐ کو خدا بنانے یہ ”کامیاب عمل“ کس کی ستم ظریفی ہے۔
 تمام دنیا کے نمائندوں کی بھری محفل میں اس کا جواب ڈاکٹر صاحب کی زبان سے ہے :

”بنی علیہ السلام کو ایک ”اساطیری رنگ“ میں پیش کرنے کا یہ عمل جس کا مصدر و منبع ایک سے
 زیادہ عناصر تھے، ”راسخ الحقیہہ گردہ“ بھی برابر اس میں شریک رہا، اور اسے اس نے قبول کیا“ ص ۲۴

”راسخ العقیدہ گروہ“ یعنی صحابہ و تابعین سے لیکر آج تک کے تمام علماء و صلحاء خدا سازی کے اسی شغل میں لگے رہے۔ پوری امت پر اساطیری رنگ آمیزی اور ”خدا سازی“ کا الزام اس ”عجوبہ زمان“ کی طرف سے لگایا جا رہا ہے، جو اسی مجلس میں اور اسی مقالہ میں چند سطر پہلے سند کو خوش اعتقادی قرار دے اساطیری (بے سند) انسانہ طرادی کرتا ہے، اور آپ کی الہی شخصیت کے بے سرو پا دعوے مانگتا ہے۔ عہدِ دلاور است و زردے کہ بکف چراغ دارد۔

پھر کثیر التعداد معجزات اور ”شانِ ایزدی“ پیدا کرنے کی تک بھی عجیب ہے۔ کیا قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام کے کثیر التعداد و معجزات کا کہیں ذکر نہیں؟ کیا قرآن عزیز بھی ان کے بقول ”اساطیری رنگ میں خدا سازی“ کی کامیاب کوشش کرتا رہا۔ خدا جانے ان کو کس نے بتلادیا ہے کہ اگر نبی کیلئے معجزہ کو تسلیم کر لیا جائے، تو نبی خدا بن جاتا ہے، کیا ان کو ”معجزہ“ کی اتنی حقیقت بھی معلوم نہیں کہ ”معجزہ صرف خدا تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے، نبی کے فعل کو اس میں قطعاً کوئی دخل نہیں ہوتا۔“ البتہ عالم اسباب سے بالاتر کسی چیز کا اس کے ہاتھ پر ظاہر ہونا اس کے دعوئے نبوت اور امور میں اللہ ہونے کی حقانیت کی دلیل ہوتا ہے۔

موصوف نے اسلامی تاریخ کی تیرہ صدیوں کے تمام علماء کی جس طرح تجہیل و تحقیر اس مذاہب عالم کا فرس میں کی اس کا ایک نمونہ اور ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں:

”گذشتہ تیرہ صدیوں کے دوران فقہار یا علماء، اسلام اپنی بحث و نظر میں جن تحقیقاتی نتائج پر پہنچے ہیں، اگرچہ ان کا پوری سنجیدگی و توجہ سے مطالعہ کرنا چاہئے، اور ان کو قرار واقعی اہمیت دینی چاہئے، لیکن اس کے باوجود یہ دیکھنے میں آئے گا، کہ اکثر معاملات میں ان کے تحقیقاتی نتائج یا تو صحیح نہ تھے۔ یا وہ اس معاشرے کے لئے موزوں تھے، جس میں وہ رہتے تھے، نہ کہ آج کے معاشرے کیلئے۔“ ص ۲۷

تیرہ صدیوں کے فقہار اور ائمہ اجتہاد کے تحقیقاتی نتائج کا پوری سنجیدگی اور توجہ سے مطالعہ کرنے کے بعد ان کی قرار واقعی اہمیت اہل نظر کے نزدیک کیا ہوگی۔؟ یہ بحث تو اپنی جگہ رہی، البتہ موصوف کے نزدیک ان کی قرار واقعی اہمیت یہی ہے کہ عہدِ

اس وقت بے معنی غرق مئے ناب ادلی معاذ اللہ

یعنی ان کے عقائد غلط، ان کی تحقیقات محض رنگ آمیزی، ان کا شعور دہم قرآن و سنت کے صحیح مطالعہ سے محروم، ان کی تفسیری، حدیثی، اور فقہی تشریحات ناقابل قبول، اہل قرآن و سنت

ادارہ اسلام کا صحیح فہم سیکھنے پر یونیورسٹی کے طالب علم اور یہودی پروفیسر اسمتھ کے شاگرد عزیزہ اور نور نظر، ادارہ کے ادارہ رفقہ کو نصیب ہوا۔ ان کے بقول یہی اصل وجہ ہے کہ اس گروہ کو ادارہ تحقیقات اسلامی کی صورت میں منظم کر کے اسلام کی نوک پلک سنوارنے اور اسے جدید زمانہ، یعنی مذاہب عالم اور دیگر نظریہ ہائے حیات سے ہم آہنگ کرنے کی خدمت پر مامور کیا گیا ہے۔ چنانچہ اسکی تفصیلی روداد بھی موصوف نے مذاہب عالم کے نمائندوں کے سامنے رکھی، فرماتے ہیں :

”صدر محمد ایوب خاں کی حکومت نے ۱۹۶۰ء میں ایک ادارہ، ادارہ تحقیقات اسلامی کے نام سے علوم اسلامی میں تحقیقات اور جدید ضرورتوں کے لئے اسلام کی تعبیر و تشریح کی غرض سے قائم کیا، ۱۹۶۲ء میں اس ادارہ کو ایک آئینی حیثیت دی گئی۔“ ص ۲۶

اسی کے ساتھ موصوف نے ”اسلامی مشاورتی کونسل“ کے قیام، اس کے اغراض و مقاصد، ان دونوں اداروں کے تعلق کی نوعیت کا ذکر کیا، اور ان کے الفاظ میں پہلی آزمائش یعنی مسئلہ سود کے بارے میں ”اسلامی مشاورتی کونسل“ کے بچس، بچس رویہ پر تنقید کرتے ہوئے اس موقع پر ادارہ تحقیقات اسلامی کی جرات رندانہ کا فتیہ شروع ہوتا ہے۔ ذرا الفاظ کی صولت اور شوکت ملاحظہ فرمائیے، ایسا لگتا ہے کہ آپ ابو حنیفہ اور شافعی کی حیثیت سے نہیں بلکہ دنیا سے اسلام کی سب سے بڑی اتھارٹی کی پوزیشن میں مصروف گویائی ہیں :

”ادارہ تحقیقات اسلامی کے تحقیقی مطالعہ“ نے بتلایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

عہد میں عرب میں وبا کا جو واقعہ نظام مروج تھا، وہ انتہائی بھونڈے قسم کے معاشی استحصال اور لوٹ کھسوٹ کا تھا، اس لئے قرآن مجید نے بار بار کی تنبیہات کے بعد اسے ممنوع قرار دیا۔ اور یہ کہ بعد کی صدیوں میں مسلمان فقہاء نے غیر ضروری طور پر اس مانعت کا دائرہ ان تمام مالی معاملات پر کہ دیا جن میں کہ اصل رقم پر کچھ اضافہ ہوتا ہو، چنانچہ اس ضمن میں ادارہ تحقیقات کا استدلال یہ تھا کہ اسلام کو آج بڑے کار لانے کے لئے سب سے پہلے تو یہ لازمی ہے کہ قرآن مجید کے احکامات کا تاریخی پس منظر سمجھا جائے تاکہ اخلاقی، روحانی اور معاشرتی و اقتصادی میدانوں میں قرآن مجید کس قسم کی اغراض کی تکمیل چاہتا ہے، ان کا تعین کیا جائے، نیز آج کے سیاق و سباق قرآن کی عملی تطبیق مغفلانہ نہیں کی جاسکتی۔“ ص ۲۷

حکومت کے قائم کردہ اس آئینی ادارہ کا یہ نقطہ فکر اور طرزِ تعبیر۔ یعنی تیرہ صدیوں کی

تحقیقات کو غلط قرار دینا، اور قرآن کی لفظی تعبیر کو حماقت بتلا کر، اسلام کی آزادانہ تعبیر و تشریح یا بلفظ صحیح تحریف و تبدیل کے بارے میں موصوف فرماتے ہیں:

”یہ طریقہ، سب طریقوں سے جنہیں عام طور پر اب تک اختیار کیا گیا ہے، اس قدر انقلابی اور بنیادی لحاظ سے مختلف ہے کہ یہ نہ صرف فقہ اور سنت نبویؐ کو بلکہ قرآن مجید کے احکامات تک کو بھی تاریخی مطالعہ کا موضوع بتایا ہے، اسے نہ محض ”رہایت پرست علماء“ بلکہ بہت سے تجدید پسند بھی قبول کرنے سے سنجیدگی کے ساتھ تامل ہی کریں گے۔“ ص ۲۵

مطلب یہ کہ تجدید پسندی کے جتنے طریقوں کا اب تک تجربہ کیا گیا ہے، وہ سب جزوی تھے، ان میں اسلام کی بعض چیزوں کو بہر حال تسلیم کر لیا جاتا تھا، لیکن ادارہ تحقیقات اسلامی کے ذہین کارندوں نے جو طریقہ درآمد کیا ہے، اس میں فرضی تاریخ کے خیالی افسانوں سے قرآن کے احکام یا بلفظ صحیح خود قرآن کو بھی بدلا جاسکتا ہے۔ اس لئے اس کے قبول کرنے کی جسارت لوگوں کو شکل ہی ہو سکتی ہے۔ خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں۔

اس سلسلہ میں موصوف نے اس طریقہ تحریف کے قبولیتی امکانات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ہے:

”اگر ایسا نہ ہوتا تو راقم السطور اسلام کا اس کے سوا اور کوئی مستقبل نہیں دیکھتا کہ وہ کچھ عرصے بعد محض چند مذہبی رسوم بن کر رہ جائے گا، جن سے کچھ آنے والے وقت تک لوگوں کی ہذب و آبی وابستگی قائم رہے۔“ ص ۲۵

موصوف خواہ مخواہ پریشان ہیں، ان سے ہماری گزارش یہ ہے، کہ وہ صرف حکومت پاکستان کی مدد سے نہیں، بلکہ اگر ان سے ہو سکے تو امریکہ اور روس اور ”وسیع تر جدید دنیا“ جس کے غم میں وہ گھل گھل کر کاٹا ہو رہے ہیں، کی مدد سے بھی اسلام کو بدلیں اس کے لئے جس قسم کے نظریات چاہیں اختراع کریں۔ اور جتنے بندوں کو بہکایا جاسکتا ہے بہکائیں۔ واستغفر من

استعطت منهم بصوتك واجدب علیہم بخيلك وشاركهم فی الاموال والاولاد وعدہم وما بعدہم الشیطان الاعزوراً۔

الغرض آپ سے جو ہو سکتا ہے کر لیں، لیکن یاد رہے کہ اللہ دین کا حافظ ہے، دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا چلے گا، اور تعبیر و تشریح امام ابوحنیفہؒ اور شافعیؒ وغیرہم ہی کی چلے گی، آپ اور آپ کے رفقاء آسمان سے سوچ اور چاند بھی لا کر رکھ دیں، تب بھی مسلمان آپ لوگوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ شارع تسلیم نہ کریں گے، نہ ابوحنیفہؒ اور شافعیؒ ماننے کیلئے۔

تیار ہوں گے۔

یہ اس مقالہ کے چند اقتباسات تھے، موصوف نے اسلامی حکومتوں، بالخصوص حکومت پاکستان کے دورِ خاپن اور منافقت اور متجددین کی بھڑ میں ذہنی بصیرت کے فقدان اور ان کی مسلسل ناکامیوں کا ذکر بھی بڑی دلسوزی سے کیا ہے، مگر ہم بغرض اختصار انہیں قلم انداز کرتے ہیں۔ البتہ ہمارا خیال ہے کہ موصوف نے اس طویل مقالہ کی نوشت و خواند پر اپنا اور معزز شہر کاٹے کا نفرنس کا قیمتی وقت ناحق ضائع کیا، کیونکہ اگر وہ چاہتے تو وہ اس تمام مقالہ کا خلاصہ پیش کر سکتے تھے، مثلاً وہ اتنا لکھ دیتے :

”جنابِ صدر محترم! دمعزز حاضرینِ کانفرنس! آپ حضرات یہاں اپنے اپنے مذاہب پر مقالات پڑھیں گے، لیکن فقیر بد قسمتی سے جس مذہب کا وکیل بن کر حاضر ہوا ہے۔ اس کا ماضی سیاہ، حال پریشان اور مستقبل خطرناک حد تک تاریک ہے، ماضی کا یہ حال کہ تمام اسلامی عقائد مثلاً معجزہ، کرامت، شفاعت، معراج وغیرہ شروع ہی سے توہم پرستی کا پلندہ ہیں۔ اور اسلامی قانون اور معاشرت کا یہ حال ہے، کہ تعددِ ازدواج، مسئلہ غلامی، جزیہ اور اقلیتوں کے حقوق جیسے موٹے موٹے مسائل میں بھی ہمارے تیرہ صدیوں کے علماء قرآنی روح کو سمجھنے، اسے اپنانے اور اسے رنگ آمیزی سے جدا رکھنے سے محروم رہے، اب ان کی کس بات پر اعتماد کر لیا جائے۔ اور اسلام کا حال یہ ہے، کہ موجودہ دور کی تمام مسلم حکومتیں دورِ خپن اور منافقت کی شکار ہیں، تجدید پسند بصیرت کے فقدان میں مبتلا ہیں، اور قدامت پسند اپنے طرزِ عمل سے سیکورزم کے داعی ہیں۔ اس پریشان کن صورتِ حال سے گھبرا کر ہمارے صدر محترم نے اسلام کو تعبیر و تاویل اور تحریف و ترمیم کے ذریعے زمانہ جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کیلئے ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کی تنظیم میں فقیر اور فقیر کے ہم مسلک رفقاء کو مامور فرمایا ہے۔ ہم نے اس انقلابی تعبیر کا ذریعہ بھی تلاش کر لیا ہے۔ لیکن خدشہ یہ ہے کہ قدیم و جدید دونوں حلقوں کی جانب سے اسکی مخالفت کی جائے گی، اسلئے اسے شرکائے کانفرنس! غدارِ دنیا بہانہ کے مسلمانوں سے اپیل کرو کہ وہ ہماری ان بری بھلی تحقیقوں کو بہر حال قبول کر لیں ورنہ اسلام کا مستقبل خطرہ میں ہے۔“

بتلائیے! کیا اس خلاصہ میں تمام مقالہ نہیں آگیا؟ مدیرِ فکر و نظر راوی ہیں۔ دروغ برگردن راوی، کہ اس مذکرہ میں ایک مقالہ چینی مذاہب پر پڑھا گیا، ڈاکٹر فضل الرحمن اس مقالہ پر تبصرہ کرنے

دالوں کے بورڈ کے ایک رکن تھے، چینی مذاہب کے ضمن میں چین کے موجودہ کمیونزم کا بھی ذکر آیا، اس سلسلہ میں ڈاکٹر فضل الرحمن نے چینی کمیونزم کے بارے میں کہا کہ آج یہ تمام مذاہب کے لئے سب سے بڑا اور کامیاب چیلنج ہے۔ ”میر فکر و نظر بیچارے سیدھے آدمی ہیں، ڈرتے ڈرتے چاچا کر بات کرتے ہیں۔ ورنہ ڈاکٹر صاحب کو اسلام سے جس قسم کی عقیدت اور وابستگی ہے، جس کا اظہار اسی مقالہ کے مندرجات سے بخوبی ہو جاتا ہے، اسے سامنے رکھیے تو اسلام کے مقابلہ میں ڈاکٹر صاحب چینی کمیونزم کو کیا، بھارت کے سکھ ازم اور سیکولرزم کو بھی بڑی آسانی سے ”سب سے بڑا اور کامیاب چیلنج“ قرار دے سکتے ہیں۔ کیونکہ ان میں بھی مشکلات بہر حال اتنی نہیں جتنی ڈاکٹر صاحب کو اسلام میں پیش آرہی ہیں۔ کیونکہ نہ ہو، ڈاکٹر صاحب جیسے ذہین آدمی کو اپنے مذہب کی اتنی ہی کامیاب و کالت کرنی چاہئے تھی۔

گر بہ میر و سگ و زیر و موش را دیوان کنند
ایں چنین ارکان دولت ملک را دیوان کنند



بقیہ، دیا بے عرب —

مشغول تھے۔ امام غزالی روئے اور فرمایا کہ افسوس علم پر ایسا زوال آیا کہ بنیت المقدس میں درس کے صرف دو سو حلقے پائے جاتے ہیں۔ امام غزالی نے اپنے وقت میں دو صد حلقے تھے درس کو کم سمجھا اور روئے، اور آج صحیح معنوں میں ایک بھی حلقہ درس یہاں نظر نہیں آتا۔ لیکن دین کی اس حالت زار پر کوئی رونے والا نہیں ہے۔

جمعہ کی نماز ہم نے مسجد اقصیٰ میں پڑھی۔ خطیب نے خطبہ میں شاہ حسین کی درازی عمر اور بقاء سلطنت کے لئے دعائیں مانگیں اور مؤذن نے باؤنڈ بند آمین کہا۔ یہ دعائیں سن کر یوں محسوس ہونے لگا کہ ہم اس قدیم زمانے میں ہیں جس میں بادشاہ وقت کی درازی عمر اور بقاء سلطنت کے لئے دعائیں مانگنا جمعہ کے خطبوں کا جزو لا ینفک تھا۔

جمعہ کی نماز کے بعد مصطفیٰ البطیر صاحب سے اتفاقاً ملاقات ہو گئی۔ یہ قدس کے قریب ”صور باھر“ نامی بستی کے باشندہ ہیں۔ اور جامعہ میں ہمارے ساتھی رہ چکے ہیں۔ ان کی معیت میں ہم نے حرم کے بعض مقدسات و بارہ دیکھے۔ مسجد اقصیٰ کی بعض تفصیلات جو ہم معلوم نہیں کر سکے تھے انہوں نے بتلادیں۔ سہناچہ اقصیٰ قدیم، محراب زکریا، جامع عمر، اور جدارہ براق وغیرہ کی نشاندہی انہوں نے ہی کر دی۔ البطیر صاحب یہ وعدہ کر کے چلے گئے کہ کل اگر وہ ہمیں خلیل الرحمن اور بعض دوسرے مقامات کی زیارت کرائیں گے۔ (باقی آئندہ)